اسوہ حسنہ کی روشنی میں اسلامی شریعت

(مقاصد۔ نظام اور طریق اجراء)

مولانا عبدالقدوس قاسمی

نبی کریم کی بعثت کے وقت ماحول میں جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مختصراً ان خرابیوں کو چند عنوانوں کے ذیل میں اس طرح سمیٹا جا سکتا ہے۔

عقیدہ کی خرابیاں

انبیاء کی تعلیمات کی رو سے انسان کی سب سے بڑی ضرورت اپنے رب کی پہچان اور اس کے ساتھ اپنا تعلق استوار کرنا ہے۔ معرفت الٰہی کی برکت سے زندگی کے بارے میں انسان کا نقطۂ نظر صحیح رخ اختیار کرتا ہے اور اس کے تعین کے بعد ہی اس کی راہ عمل کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس وقت کے عرب مشرکین اور دیگر اہل مذاہب کی آراء باطلہ کی جتنی تفصیل دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے عربوں میں بدعقیدگی سے متعلق تین اہم خرابیاں تھیں۔ خدا کی صفات سے انکار، نبوت سے انکار اور روز جزاء سے انکار۔ عمل کی وہ دوسری خرابیاں جن کی وجہ سے عربوں کی معاشرتی حالت ناگفتہ بہ تھی انہی تین خرابیوں کے نتیجہ میں ابھر آئی تھیں۔

معاشرتی خرابیاں

کمزوروں اور ناتوانوں پر زبردستوں کا تسلط اور ان کے ساتھ بے انصافی اور ان کی حق تلفی، غلاموں کے ساتھ ناروا سلوک، عورتوں کے حقوق کا غصب، رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی، تعصب کا غلط استعمال، ایسی خرابیاں تھیں جن کی وجہ سے ان کے آپس کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔

دوسری طرف بے حیائی جس کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں "تبرج الجاہلیۃ" ہے اور جو اس زمانہ کی عورتوں کی خود آرائی وخود نمائی کی بد ذوقی کا مظاہرہ تھا نہایت زوروں پر تھی جس کی وجہ سے معاشرہ کے اخلاق پر بڑا زوال آیا تھا۔ پڑوس میں مجوسی بستے تھے۔ ان میں نکاح سے متعلق بعض بد اخلاقیوں کو مذہبی تحفظ حاصل تھا۔ اس کا اثر عربوں پر اس حد تک تو نہ ہوا تھا۔ تاہم ان کے اپنے معیار اخلاق میں اس نے تنزل ضرور پیدا کر دیا تھا۔

ذریعۂ معاش کی خرابیاں

جائز و ناجائز کا کوئی اصول مقرر نہ تھا۔ ہر شخص اپنی طاقت کے بل بوتے پر دوسرے کی جس ملکیت کو چاہتا اپنے تصرف میں لے آتا تھا۔ چوری بری سمجھی جاتی تھی لیکن ہوتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں لوٹ مار، غارت گری، چھینا جھپٹی وغیرہ ایسے امور، جن میں طاقت کا مظاہرہ ہوتا تھا بہادری اور شجاعت کے کارنامے تھے۔

جوا بازی، جو فضول خرچی اور ناجائزہ کمائی کے ذریعہ فیاضی کا ایک مجموعہ تھا، نہایت فخریہ مشغلہ تھا۔

معاملات کی دوسری خرابیوں کے علاوہ سودی کاروبار ان کا معمول تھا۔ سود خوار لوگ اپنے کاروبار کو عام تجارت کی طرح جائز معاملہ تصور کرتے تھے اور غریبوں، محتاجوں اور عام لوگوں کا خون چوستے تھے۔ اس بد معاملگی کے نتیجہ میں معاشرہ میں آپس کی الفت اور محبت مفقود تھی۔ اخلاقی کمزوریاں عام تھیں۔ وعدہ خلافی، بدعہدی، امانت میں خیانت، دروغ گوئی

وغیرہ ہر بداخلاقی اگرچہ ذہناً معیوب تھی۔ تاہم عملاً کسی کو ان کے بارے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔

ان خرابیوں کے عام ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کا ادبی ذوق بہت بگڑا ہوا تھا عرب شاعر اپنی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار اور ادبی استعداد کے لحاظ سے اپنی بہترین صلاحیتوں کا نہایت غلط استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کی زبان پر کسی وقت نہایت اونچے درجے کے نصائح ہوا کرتے تھے اور وہ اخلاق کی شستہ تلقین میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اور دوسرے وقت نہایت فخریہ انداز میں اپنی فحش بداخلاقی کی من وعن تصویر پیش کرتے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ امراُالقیس کا معلقہ اس کی بلاغت اور شہرت کی بنا پر بھی اور خود امراُالقیس کی وجاہت کی بنا پر بھی ہمیشہ مقبول رہا۔ یہ قصیدہ عرب شاعر کی بداخلاقی کے مظاہرہ کی روشنی مثال ہے۔

عربوں کی سیاسی بدنظمی اس پر مستزاد تھی۔ یہ لوگ خود حکومت کی کسی بڑی ذمہ داری کو سنبھالنے کا تجربہ نہ رکھتے تھے۔ جنوبی عرب کے "اذواء واقیال" کے جو خاندان ان علاقوں میں اپنی منظم اور وسیع سلطنتوں کے لئے مشہور تھے۔ اگرچہ ان کے بارے میں عربوں کی اپنی روایات نہایت شاندار تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے خیال میں ذوالقرنین بھی انہی میں سے ایک بادشاہ تھا جس کی سلطنت ربع مسکون کے شرق و غرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم جو کچھ بھی ہو بعثت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے وقت یہ قصے داستانہائے پارینہ ہو کر رہ گئے تھے۔

پہلی صدی قبل ہجری کی حالت یہ تھی کہ جنوبی عرب پر عیسائیوں اور ایرانیوں کی تاخت پےبعد دیگرے کامیابی سے ہو رہی تھی۔ مشرقی حصہ میں ایرانیوں کے زیر سایہ باج گذار عرب حکومتیں تھیں۔ اور شمالی حصہ میں رومیوں کی باج گذار غساسنہ عرب کی حکومت تھی۔ وسط عرب کی سرزمین آزاد تھی مگر ان غیر ذی زرع زمینوں کے مالک، جن کا گذارہ چراگاہوں اور مویشی پالنے پر تھا یا ان چھوٹی چھوٹی زمینوں اور نخلستانوں پر تھا جس پر تسلط امارت و ثروت کی بڑی علامت تھی۔ وہ ہمیشہ باہم برسرپیکار رہتے تھے۔

مکہ معظمہ کے قریش خانہ کعبہ کی برکت سے پر امن ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے اور شمال و جنوب کے درمیان تجارت کا رابطہ قائم کئے ہوئے تھے، وہ ان حکومتوں اور شہنشاہیوں سے نہایت مرعوب تھے۔ دوسری طرف یثرب کے باشندے یہودیوں کی اقتصادی سیاست کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔

اس فاسد نظام کو بدلنے اور انسانی معاشرہ کو صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے خاتم النبیین آقائے نامدار محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

اسلامی شریعت کا نظام

بعثت نبوی علی صاحبہا السلام کا مقصد مخلوق کو خالق سے ملانا اور دین کا سکہ رائج کرنا تھا، مگر خاتم النبیین جو دین لائے اور جس کا نام اسلام ہے اس کا مفہوم وہ نہیں جو دیگر اہل مذاہب نے معاشرہ کی جاہلیت کے ساتھ صلح کر کے اپنے اپنے ادیان و مذاہب کا مقرر کیا ہے، اور جس میں قیصر اور خدا کی عملداریوں کو الگ الگ کر کے دکھایا گیا ہے۔ بلکہ اسلام کا مفہوم وہ نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبہ اور انسانی ضرورتوں کے ہر گوشہ پر حاوی ہو، جس میں دین، نفس، مال، نسب، عقل اور عزت و آبرو کی حفاظت کا پورا پورا سامان موجود ہو، جس میں ایک طرف بندہ اور خالق کا باہمی ربط انفرادی اور اجتماعی دونوں رخ سے استوار ہو، عقیدہ کی صحت اور صحیح عقیدے کی اشاعت و حفاظت کا بھی انتظام ہو اور خدائے واحد کی پرستش کی طرف بھی پورا معاشرہ فرد کے لحاظ سے بھی اور جماعتی لحاظ سے بھی اچھی طرح متوجہ ہو، جس میں اخلاق کا ایک عمدہ نظام ہو اور معاشرہ کا ہر فرد اس نظام کا اپنے ضمیر کی آواز پر پابند ہو، جس میں آپس کے تعلقات ایک ضابطے کے طور پر استوار ہوں، ہر شخص کو اپنے حقوق کا بھی علم اور اپنے واجبات سے بھی واقف ہو اور اگر کوئی شخص اپنی حدود سے تجاوز کرے تو اس کو اپنی تعدی کی سزا دینے اور اپنی حد پر واپس لانے کے لئے قانون کا دباؤ بھی موجود ہو، اور معاشرہ کا اخلاقی دباؤ بھی کافی ہو، غرض اسلام ایک

ہمہ گیر نظام ہے جس میں زندگی کی ہر ضرورت کا مداوا موجود ہے۔

اس نظام کے پانچ اجزاء متعین کئے گئے ہیں، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور عقوبات۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے تیئس سالہ دور میں اس پورے نظام کو جاری فرمایا اور معاشرہ کی بنیادیں اس نظام کے مطابق استوار کر دیں۔ اور اس نظام کی تفصیلات تحریری طور پر کتاب و سنت کے ذریعہ متعین کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ایسے ماحول میں ہوا کہ معاشرہ کی خرابیاں جڑوں سے کٹ گئی تھیں۔ قرآن کریم کے انہی اصول اور قوانین اور ان کی وضاحت کے لئے اور عمل اطلاق کے لئے احادیث رسول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی فیصلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔ اخوت و مساوات پر مبنی معاشرہ بسر کرنے والی امت بھی موجود تھی اور حقوق و واجبات کا تعین کرنے والا مفصل قانون بھی سا اور اس قانون کو جاری اور نافذ کرنے والے اور تنازعات میں بے لاگ اور انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے والے منصف قاضی اور حاکم بھی موجود تھے۔

ہر مسلمان شریعت کے ہر ہر جزء کا اپنے آپ کو پابند سمجھتا تھا۔ وہاں عبادت و معاملہ میں اس تفریق کی گنجائش نہ تھی کہ جزء کو دین سمجھا جائے اور دوسرے جزء کو اپنی مرضی یا عوام کی مرضی پر منحصر سمجھا جائے ہر مسلمان کی ایک مجموعی شخصیت تھی جو دین کے تمام اجزا پر عمل کرنے کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی۔

قرآن کریم نے بعض آیات میں مسلمانوں کی جو تصویر بہ حیثیت مجموعی پیش کی ہے مثلاً سورۃ المؤمنون (قد افلح المومنون الآیات) سورۃ الفرقان (وعباد الرحمن الآیات) سورۃ الذاریات (وانہم کانوا قبل ذلک محسنین) سورۃ البقرہ (لیس البر ان تولوا الآیۃ) اور سورۃ التوبہ (التائبون العابدون الآیہ) میں یا سورہ بنی اسرائیل کے رکوع سوم و چہارم میں یا سورۃ الانعام کی آیات قل تعالوا الآیات میں جو احکام دیئے گئے ہیں۔ امت محمدیہ کا اس وقت کا نقشہ ہو بہو ان کے مطابق تھا۔

طریق اجرا

اس مقالہ کا اصل مقصد اس طریق کار کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس نظام کو جاری کرنے کے

لئے اختیار کیا گیا۔ اگر صرف زبانی بیان کرنے یا کسی لکھی ہوئی تحریر کے ذریعہ قوم تک پہنچانے سے ایک نظام رائج ہو سکتا تو یہود کے پاس تورات موجود تھی، اس کا نظام رائج ہو جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک نظام کو رائج کرنے کے لئے ایک امت کی ضرورت تھی جو اس نظام کو اپنے اوپر رائج کرنے میں پس و پیش نہ کرتی، اور امت کو ایسے رہ نما کی ضرورت تھی جس کی ہر بات بلا چون وچرا تسلیم کی جاتی ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں امت کو وہ رہ نما عطا ہوا جس کی ہر بات اپنے اعتدال و سداد کی بنا پر معیار حق تھی اور صحابہ کرام میں اسلامی شریعت کو وہ امت ملی جو قرآن کریم اور سنت نبوی کے احکام کو عملی شکل دینے اور اپنے آپ پر ان کا اجرا کرنے میں سعادت محسوس کرتی تھی۔

یہ ایک اجمال ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ۱۳ ق ھ میں غار حرا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت سپرد کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے ہوئے گھر تشریف لائے اور گھر والوں سے فرمایا یا خدیجہ "لقد خشیت علی نفسی" (اے خدیجہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو چلا ہے) تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس عظیم کام کی وہ مشکلات تھیں جو اس کی تکمیل میں ان کو بعد میں قدم قدم پر پیش آئیں۔ اور اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کا واحد سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات تھی جس کے بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ "کلا واللہ لا یخزیک اللہ ابداً" ہرگز خطرہ نہیں اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ناکام اور رسوا نہیں کرے گا)

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال یہ تائید الٰہی تھی جس کی وجہ سے دشمنوں کا ہر حیلہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گیا اور حق کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ وہ تدابیر کیا تھیں جن کے ذریعہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، نظام شریعت تکمیل کو پہنچا، اور عملی شکل میں زندہ حقیقت بنا، ان کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ سب سے پہلی تدبیر ایک ایسی امت کی تشکیل تھی جو اعتصام بحبل اللہ نبی کریم کی متابعت و اطاعت اور آپس کی اخوت و الفت کے ذریعہ ہمیشہ یک دل و یک جان رہی اور جس نے قرآن کریم کی ہر ہدایت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد کو عمل میں لانے کے لئے جان کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہ کیا۔

دوسری تدبیر یہ تھی کہ امت کی نظریں دنیا کی کامیابیوں کی بجائے آخرت کی سرخروئیوں کی طرف پھیر دی گئیں اور ان کے اذہان میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا کہ آخرت کی فلاح کے لئے دنیا کی ہر تکلیف کو ہیچ سمجھنا اور آخرت کی رسوائیوں سے بچنے کے لئے دنیا کے ہر عیش و راحت کو ٹھکرانا نہایت نفع مند تجارت ہے۔

تیسری تدبیر یہ تھی کہ جب بارہ سال کے عرصہ میں ایک مجاہد اور سخت کوش جماعت تیار ہو گئی تو اس جماعت کو اکثریت کے نرغے سے بچانے کے لئے ایسے گوشے کی تلاش کی گئی جہاں یہ جماعت اپنے عقائد و عبادات کے علاوہ اپنے نظام معیشت و معاشرت کو بھی اجاگر کر کے عمل میں لا سکے۔ یثرب کی مقدس سرزمین وہ زرخیز خطہ تھا جہاں شجر اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ یہ سرزمین نہ ہوتی تو مکہ والوں کی اکثریت کے مقابلہ میں صحابہ کی اقلیت اپنے مؤقف کو تو پھر بھی نہ چھوڑتی، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مہربان عم مکرم حضرت ابو طالب سے فرمایا تھا کہ واللہ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں میں اپنے اس کام سے باز نہ آؤں گا تا آنکہ یا اللہ تعالیٰ اسے کامیاب کر دے یا میری جان اس راہ میں نکل جائے، صحابہ کرام کے لئے بھی اسلام کو اپنے ذروۂ عروج تک پہنچانا دل وجان سے عزیز تھا، اگر وہ اس مقصد کو نقطۂ تکمیل تک نہ پہنچا پاتے تو وہ اپنی جان تو اس راہ میں قربان کر سکتے تھے، تاہم اندازہ یہ ہے کہ اگر یثرب کی سرزمین نہ ہوتی تو مکہ کی اکثریت کو زیر کرنا بہت مشکل ہوتا۔ جہاں اکثریت ایک امر منکر کو رواج دینے پر تلی ہوئی ہو وہاں اقلیت کا طرز عمل کتنا ہی قابل تحسین کیوں نہ ہو اسے فروغ حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اسلام نے حق و صداقت کا معیار اکثریت کو نہیں رکھا۔ اور نہ اکثریت کے معیار پر کوئی صداقت رائج کی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی غلط رواج کسی زمانہ میں ختم نہ ہوتا۔ غلط رواجوں کو ختم کر دینے کا کارنامہ ہمیشہ حق و صداقت کی علمبردار اقلیت ہی انجام دیتی رہی ہے۔ تاہم ایک معاشرہ کے نظام کو یکسر بدل دینا اور پورے معاشرہ کو ایک نئے نظام کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کرنا آسان

کام نہیں۔ ایسے کام کیلئے سر دھڑ کی بازی لگانا آسان ہے لیکن خود اس مقصد کا حصول صرف قربانی کے ذریعے نہیں بلکہ مناسب اور موثر تدبیر ہی پر منحصر ہوتا ہے یہ مخصوص تدبیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ایک ایسے گوشہ کی تلاش تھی جہاں کے لوگ بحیثیت مجموعی اسلامی نظام کو قبول کرلیں اور پھر اس گوشہ کو مرکز بنا کر اس نظام کو آہستہ آہستہ آگے پھیلا دیا جائے۔

اس مقصد کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے مایوس ہوکر طائف اور طائف سے مایوس ہوکر کئی دیگر قبائل کی طرف رجوع کیا اور آخر کار یہ سعادت مدینہ منورہ کے اوس وخزرج کے حصہ میں آئی اور ان کا شہر نظام اسلام کو رائج کرنے اور اسے آگے پھیلانے کے لئے مرکز مقرر ہوا۔

حضرت ابو قیس صرمہ رضی اللہ عنہا نے اسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔

ثوی فی قریش بضع عشرۃ حجۃ — یذکر لو یلقی صدیق مواتیا
ویعرض فی اہل المواسم نفسہ — فلم یر من یووی ولم یر داعیا
فلما أتانا أظہر اللہ دینہ — فاصبح مسرورا بطیبۃ راضیا!
والفی صدیقا واطمأنت بہ النوی — وکان لہ عونا من اللہ بادیا!
فاصبح لا یخشی من الناس واحدا — قریباً ولا یخشی من الناس نائیا

چوتھی تدبیر یہ تھی احکام میں تدریج وتیسیر۔

تیسیر کی کافی تشریح وتفصیل شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ مبحث ششم میں دی ہے۔ وہاں ملاحظہ کی جائے۔ تدریج کی چند مثالیں یہ ہیں۔

۱۔ توحید پر نظام اسلام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ "فلیعبدوا رب ہذا البیت"، قرآن کریم کی ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک سورت کی آیت ہے۔ ہر مسلمان بت پرستی سے بیزار تھا اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ بت شکنی کی ابتدا بھی مکی دور میں ہی کردی جاتی یا کم ازکم مدنی دور کی ابتدا میں اس کا اعلان کردیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس حکم میں تدریج یہ رہی کہ جہاں تک

مسلمانوں کے اپنے گھرانوں کا تعلق تھا وہ تو بتوں اور تصاویر سے پاک رہے، مگر دوسروں کے بارے میں حکم یہ دیا گیا کہ لاتسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔

مدینہ منورہ میں بعض نوجوان صحابہ چوری چھپے وہاں کے مشرکین کے لکڑیوں کے بتوں کو توڑتے رہے لیکن یہ کام نہ حضور کے حکم سے ہوا اور نہ ان کے علم میں لایا گیا۔ ویسے مدینہ منورہ کی آبادی میں اگرچہ چند مشرک برائے نام ابتدائی مہینوں میں باقی بھی رہے تھے پھر بھی ان کی اور ان کے معبودوں کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی۔ بت شکنی کا فریضہ علی الاعلان اس وقت سے شروع کیا گیا جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ خانۂ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دے چکے۔

۲۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ اپنے اجمالی معنوں میں ابتدائی عہد میں رائج تھیں۔ سورہ مزمل قرآن کریم کے ابتدائی عہد کی سورۃ ہے اس میں واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً کا حکم موجود ہے، اس کے باوجود پنج وقتہ نماز ہجرت سے ایک سال قبل اور زکوٰۃ کسی شکل میں ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئی۔ احکام صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پوری تکمیل ۶ھ اور ۸ھ میں ہوئی۔ روزہ کسی نہ کسی شکل میں اسلام کے ابتدائی عہد میں رائج تھا لیکن فرض ۲ھ میں ہوا حج ۹ھ میں فرض ہوا۔

۳۔ دوسرے احکام بھی تدریجاً نازل ہوتے رہے، چند کی تفصیل یہ ہے۔ ۲ھ میں اذان کا طریقہ جاری ہوا۔ قبلہ کا رخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف بدل دیا گیا جہاد کا حکم نازل ہوا۔ صدقہ فطر واجب ہوا۔ بدر کے غزوہ میں شرکت کے بعد مال غنیمت اور جنگی قیدیوں سے متعلق احکام نازل ہوئے۔

۳ھ۔ قصاص و دیت کے احکام نازل ہوئے۔ وصیت کرنے کا حکم بھی نازل ہوا۔

۴ھ۔ حرمت شراب کا حکم نازل ہوا، صلوٰۃ الخوف کا طریقہ بتایا گیا۔ میراث کے احکام نازل ہوئے نکاح کے بارے میں اصلاحات صادر ہوئیں۔

۵ھ۔ حد قذف، حد لعان اور حد زنا کے احکام نازل ہوئے۔

۶ھ۔ سرقہ میں قطع ید اور حرابہ کی مختلف انواع کی سزا نازل ہوئی۔

۷ھ۔ اراضی مفتوحہ کے احکام اور زراعت اور باغبانی کے احکام کا اجرا ہوا۔ ربا البیع کی

ممانعت کی گئی اور بعض ہم جنس اشیاء کو اپنی ہم جنس اشیا کے تبادلہ میں مقدار کے فرق یا وقت کے صلہ کے ساتھ بیچنا ممنوع قرار پایا۔

۸ھ ۔ زکوٰۃ کی تفصیل مقرر ہوئی ۔ سود ممنوع قرار پایا

وغیرہ وغیرہ ۔

پانچویں تدبیر یہ تھی کہ معاشرہ کو صالح ادب فراہم کر دیا گیا۔ جو لوگ اس سے پہلے امرأ القیس کے فحش تحریر کو شاہکار ٹھہرا کر خانہ کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کرتے تھے، اب وہ حضرت لبید رضی اللہ عنہ کی طرح جاہلیت کے ان شاعرانہ کارناموں کو قدموں تلے روند کر قرآن کریم کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ وہ سرخ قبے نابید ہو گئے جو قبائل اپنے یکتا شاعر کے اعزاز میں نصب کیا کرتے تھے ہر طرف اللہ تعالیٰ کے معجزانہ کلام اور رسول اللہ کی احادیث کے چرچے ہونے لگے، قرار اور حفاظ کی قرأت نے شعر کی جگہ لے لی اور احادیث نبوی نے قصہ گویوں کی داستانوں کی مجالس سرد کر دیں۔ اس سے رفتہ رفتہ پاکیزہ ادب کا وہ سرمایہ وجود میں آیا جو صدیوں گذرنے پر بھی تجدید و تبدیل کا محتاج نہیں اور جو ہمیشہ اسلامی شریعت کے رواج کی پشت پناہی کرتا رہا۔

چھٹی اہم تدبیر یہ تھی کہ رائے عامہ کو بیدار کر دیا گیا۔ معیاری اقدار کو معروف کا نام دے کر ان کی عظمت اذہان میں جاگزیں کر دی گئی اور امت محمدیہ کا یہ فرض ٹھہرایا گیا کہ جب کبھی ان کو تسلط و اقتدار نصیب ہو وہ معروف کو حکماً نافذ کر دیں۔ اور منکر سے حکماً روک دیں۔ معروف و منکر کی اصطلاحوں کا ذکر دو مرتبہ مکی سورۃ لقمان میں حضرت لقمان کے نصائح کے ضمن میں ہوا ہے۔ تاہم مومنوں کو معروف کے امر اور منکر سے نہی کا حکم مکی دور میں نہیں دیا گیا وہاں تواصی بالحق کی تلقین تھی۔ اس لئے کہ مکہ اور اس کے آس پاس منعقد ہونے والے بازاروں میں جن رؤسا اور شعرا کا دور دورہ تھا انہوں نے اپنے معاشرہ میں معروف و منکر کے باہمی امتیاز کا احساس ختم کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ کے معاشرہ میں جب یہ امتیاز واضح ہو گیا اور جب اسلامی معاشرہ کے رائج نظام کی بدولت معروف (مناسب) واقعی معروف یعنی جانی پہچانی چیز اور منکر (نامناسب) واقعی منکر (اوپرا اور غیر معمولی) بن گیا تو معروف کو

رائج کرنے اور منکر سے اجتناب کرانے کے احکام مدنی سورتوں میں آٹھ مقامات پر تاکید سے نازل ہوئے اور بہت سے مقامات پر معاملات کی بنیاد اس اجمالی اصطلاح معروف پر رکھی گئی ۔

اور سب سے آخری تدبیر یہ تھی کہ ایسے افراد کی تربیت کی گئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے خوب ماہر ہوں جن کو امت میں اثر و نفوذ اپنی صلاحیت اور تقویٰ کی بنا پر حاصل ہو اور جو حضور کے بعد بھی اسلامی شریعت کے نفاذ کے تسلسل کو جاری رکھیں ۔